یہ اقدار جب کوئی شکل اختیار کرتی ہیں تو ان کی وہ شکل شریعت ہوتی ہے، اور اس میں حالات و اقتضاء کے مطابق مناسب تغیر بھی ہو سکتا ہے۔ غرض دین متغیر نہیں، اور شریعت جامد نہیں۔ شریعت صورت (FORM) ہے اور دین اسکی روح (SPIRIT) ہے۔ قرآن کے ہر حکم کی اسپرٹ ہی اقدارِ عالیہ ہیں جو ابدی ہیں، نہ کہ اسکی ظاہری شکل و صورت۔

قرآن نے دین بھی دیا ہے اور شریعت بھی دی ہے، وہ جہاں کوئی حکم دیتا ہے اور اس حکم کی ظاہری شکل و صورت بتاتا ہے وہاں اس کا اصل مقصد بھی بتا دیتا ہے کہ کہیں انسان ان ہی ظاہری احکام میں پھنس کر نہ رہ جائے اور حقیقی اقدار کے حصول کو فراموش نہ کر بیٹھے، اس کی چند مثالیں دیکھئے :-

(الف) وہ روزے کا حکم دیتا ہے کہ کتب علیکم الصیام لیکن ساتھ بتاتا ہے کہ روزہ بذاتِ خود اقدارِ عالیہ میں داخل نہیں، اس کا اصل مقصد وہ اعلیٰ قدر ہے جو اس روزے کا نتیجہ ہے یعنی لعلکم تتقون، یوں کہیئے کہ روزہ تو کسی مجبوری میں چھوٹ بھی سکتا ہے لیکن تقویٰ ایک ایسی مستقل اور ابدی قدر ہے جو کسی وقت بھی نہیں چھوڑی جا سکتی اور یہ قدر ایک صفت الٰہیہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں داخل ہے یعنی اللہ تعالیٰ برّ اور اھل التقویٰ بھی ہے۔

(ب) وہ قربانیوں کا ذکر فرماتا ہے، تو صاف بتا دیتا ہے کہ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون خدا تک نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ اس کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرتا ہے۔

(ج) وہ سمت قبلہ کا تذکرہ فرماتا ہے کہ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر الخ (۲ : ۱۷۷) یعنی نیکی یہی نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ اصل نیکی ان کی ہے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی محبت میں رشتے داروں، یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور سائلوں کو مال دیا اور قیدیوں کی بھلائی میں صرف کیا۔ اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، اور جب کسی بات کا قول و قرار کر لیا تو اپنی بات پر پورے اترے اور تنگی و تکلیف میں نیز ہلا چلی کے وقت ثابت قدم رہے، یہی لوگ صادق و مخلص ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں"۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مشرق و مغرب کی طرف رخ کرنا اصل میں کوئی قدر اور کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ اصل نیکی اور اصل اقدار وہ ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے اور خود یہ بیان کردہ اقدار بھی ایسی ہیں جو دوسری اعلیٰ اقدار کی طرف لے جاتی ہیں اور اس طرح قدر الاقدار کی طرف صعود ہوتا جاتا ہے۔

(۴) اب اس چوتھے نکتے کی طرف آیئے جس کا تعلق اقدارِ حیات یا اسمائے حسنیٰ کی محافظت سے ہے ـــــ ایک شخص اگر ذہین بھی ہو، غصے ور بھی اور غیر متمدن بھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام صفات کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اس کا ذی الحس ہونا۔ تقریباً اسی طرح چند مختلف اقدار کا سرچشمہ کوئی ایک ہی قدر ہوتی ہے۔ اسمائے الٰہیہ کو ملا کر اگر کچھ مرکزی اقدار تلاش کی جائیں تو وہ ہوں گی۔ خلق و ربوبیت، رحمت، عدل، علم، جمال اور خیر وغیرہ اور پھر ان سب کا

مجموعہ ہے اللہ، اگر آپ کہیں لا مَلِك الا اللہ، یا لا رزاق الا اللہ، یا لا خالق الا اللہ، تو یہ کلمے اپنی اپنی جگہ بالکل صحیح ہونگے لیکن یہ کسی ایک صفتِ خداوندی کا اقرار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ کلمۂ طیبہ کی بنیاد ان کلموں پر نہیں رکھی گئی بلکہ کلمۂ طیبہ ہے لا الٰہ الا اللہ۔ اِس الٰہیت کے اقرار میں تمام صفات الٰہیہ سمٹ کر ایک غیر منقسم وحدت کی شکل میں آجاتی ہیں اور اس ایک اقرار سے تمام صفات کا اقرار ہو جاتا ہے۔

اللہ کا ترجمہ معبود یا حاکم وغیرہ کرنا اس کی کامل صفاتی ہمہ گیری کو واضح نہیں کرتا۔ ہمارے نزدیک اس کا سب سے زیادہ جامع اور بہتر مفہوم ہے نصب العین، یعنی مقصودِ حیات کا وہ منتہا جس سے آگے کوئی مقصود ہی ممکن نہ ہو اور نیز وہ مقصود خود ایک غیر منقسم وحدت ہو۔

(۵) اللہ کے نصب العینِ حیات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کو اپنے اندر اسی متوازن ہم آہنگی کے ساتھ ایک وحدت بنا کر سمو لیا جائے اور اسی انداز سے پوری کائنات پر تصرّف کیا جائے۔ یہی وہ مقصودِ حیات ہے جسے قرآن کہتا ہے صبغۃ اللہ۔ اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اور اسی مضمون کو حضور اکرمؐ نے یوں ادا فرمایا ہے کہ تخلّقوا باخلاق اللہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرو۔

(۶) کسی ایک اعلیٰ قدر کو اپنا لینے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری اقدار بھی ساتھ ساتھ کھنچی چلی آتی ہیں، خواہ وہ اسی "قدر" کی ذیلی اقدار ہوں، یا اسی کے مساوی کوئی دوسری قدر ہو، مثلاً کوئی شخص اگر صادق ہو تو وہ صرف صادق ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس کے تقاضے سے وہ شجاع بھی ہوگا۔ امین بھی ہوگا، صاف دل بھی ہوگا وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ ساری صفات صفتِ صدق کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اقدارِ عالیہ کی مثال تو ایک ایسے جال کی سی ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے سے پیوستہ ہے، کسی ایک کو مضبوطی سے پکڑ کر کھینچا جائے تو دوسرے حلقے بھی اسکے ساتھ ہی کھنچ آتے ہیں۔

(۷) ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس کے وظائف میں کوئی چیز ایسی سامنے نہیں آتی جس کو ہم خالص خیر یا خالص شر سے تعبیر کریں، جتنی چیزوں سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے وہ مخلوط و ممزوج سی ہوتی ہیں، لہٰذا ہماری قدرت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خیر غالب کو اختیار کیا جائے اور شر سے جہاں تک دامن بچایا جا سکتا ہو بچا لیا جائے۔ یہی کوشش مسلسل ارتقا کی طرف لے جائیگی اور یہ اُس خیرِ مطلق کی طرف بڑھنے کی ایک لگاتار کوشش ہوگی، جسے ہم قدرِ الاقدار کہتے ہیں اسی کا دوسرا نام اللہ ہے اور وہی انسان کا نصب العین ہے۔ تمام اقدار اور انکے ارتقائی زینے اسی لئے ہیں، کہ اس نصب العینِ حیات تک رسائی ہو سکے۔

(۸) کائنات میں اقدار کے کارفرما ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک چیز میں ایک ہی قدر کارفرما ہے بلکہ ایک ہی وقت میں کئی اقدار مل کر ایک وحدت کی شکل میں کارفرما ہوتی ہیں۔ ایک پودے کے اندر ایک ہی وقت میں حُسن بھی ہے، لطافت بھی، ربوبیت بھی ہے اور ارتقا بھی وغیرہ وغیرہ لیکن یہ سب کی سب مل کر ایک وحدت کی شکل میں اس پودے میں کارفرما ہیں۔

ان ہشت نکاتی تفصیلات کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ تمام اقدارِ عالیہ کا سرچشمہ وہ قدر الاقدار اور وہ خیرِ مطلق ہے

جیسے اللہ کہتے ہیں اور اس کے اسمائے حسنیٰ میں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہی اصلی اسلامی اقدار ہیں۔ انسان کا نصب العین ان ہی تمام صفات کو اسی الٰہی تناسب کے ساتھ ایک وحدت بنا کر اپنے اندر سمو لینا ہے کیا عجب ہے کہ و علّم آدم الاسماء کلّھا سے مراد یہی ہو کہ اس نے انسان کو ان تمام اسمائے الٰہیہ یعنی ابدی اقدار کا علم دے دیا تاکہ وہ ان کو اپنا کر خلافت ارضی کا حق ادا کر سکے ۔

ان اقدار کو دنیا میں کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ یہ بڑا ہی مشکل سوال ہے مشکل اس لئے نہیں کہ اس کا طریقہ نہیں بتایا جا سکتا۔ بلکہ یہ اس لئے مشکل ہے کہ ہم جو کچھ بھی بیان کریں صرف ایک اسکیم ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ محض اسکیموں سے کوئی حقیقت بروئے کار نہیں لائی جا سکتی اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں اقدار نہ فقط بدل ہی گئی ہیں بلکہ بہت سی قدریں الٹ بھی گئی ہیں۔ آج ہماری سوسائٹی میں شاید ہی کوئی قدر ایسی ہو جسے اس کا صحیح مقام دیا گیا ہو مختلف طبقوں میں اس کی دو مثالیں دیکھئے :—

(الف) ایک شخص بزرگوں کی کسی گدّی پر بیٹھا ہے، خاص صوفیانہ وضع قطع رکھتا ہے، خانقاہ داری کے تمام مراسم عرس فاتحہ وغیرہ ادا کرتا ہے۔ لوگ اس کی قدم بوسی کرتے ہیں اور اسے نذرانے دیتے ہیں، یوں بھی وہ ہر طرح نیک اور صالح ہے لیکن اگر وہ ایک دوکان کھول کر بیٹھ جائے تو لوگ اسے بزرگ سمجھنا چھوڑ دینگے اور قدمبوسی و دست بوسی بھی ختم ہو جائیگی۔ جرم کیا ہے؟ صرف یہ کہ اس نے اپنی قوت بازو اور محنت سے رزق حلال پیدا کرنے کی طرف کیوں توجہ کی؟

(ب) ایک شخص خلوص دل سے خدمت قوم کرتا ہے، دیانتدار ہے، قابل اعتبار ہے، واقف و دانا ہے، ساری اہلیتیں قیادت کی رکھتا ہے لیکن وہ الکشن میں نہیں کھڑا ہو سکتا کیونکہ زرِ ضمانت جمع کرنے کیلئے اس کے پاس رقم نہیں اور وہ ایسا جاگیردار نہیں جو ووٹوں کو خرید سکے ۔

(ج) ایک شخص تمام طرح کا تقویٰ، صلاح اور انسانیت رکھتے ہوئے بے وقعت ہے کیونکہ وہ دولتمند نہیں اور دوسرا ساری بدعنوانیاں کرتا ہے پھر بھی معزز ہے اس لئے کہ اس کے پاس دولت ہے ۔

غرض نسل، رنگ، وطن، زبان اور پیشے کا امتیاز بھی موجود ہے اور دولت و غربت کا فرق بھی عزت، ذلّت کا معیار، ترک و اختیار کی کسوٹی، محبت و عداوت کی اقدار سب کچھ اتنا بدلا ہوا ہے کہ جاہلیت اپنی کامیابی پر خوش ہو رہی ہے اور اسلام اپنے نام لیواؤں پر رو رہا ہے۔ ان حالات میں یہ سوال بہت ہی سخت ہے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کو کس طرح اور کیونکر بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ لیکن بہرحال یہ سوال ایسا ہے کہ اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس مشکل کا کوئی حل نہ سوچا جائے تو فقط یہی نہیں ہوگا کہ نشستند و گفتند و برخاستند بلکہ اندیشہ ہے کہ حالات ہر روز پہلے سے بدتر ہوتے جائینگے ۔

انقلابات کی تاریخ بتاتی ہے کہ روحانی و اخلاقی اقدار کی محافظت اور قیام ہمیشہ بوریہ نشین درویشوں اور بے سروسامان قلندروں نے کیا ہے، خواہ وہ انبیا ہوں یا ان کے روحانی جانشین یعنی اولیا اللہ۔ بڑے بڑے سرکش قسم کے فرمانرواؤں کو یا بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہماری اسمبلیاں اور سمپوزیم ٹھیک نہیں کر سکیں۔ لیکن ان خدا مستوں کی ایک نگاہ کیمیا اثر نے ان کی

کایا پلٹ دی حضرت اکبرؔ الہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ ؎

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور اسی مضمون سے ملتا جلتا اقبالؒ کے شعر کا مضمون ہے ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی جو آنکھیں ہوں تو دیکھ ان کو یدِ بیضا لئے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

اس وقت ایسے قلندر ہماری آنکھوں کے سامنے نہ تو موجود ہیں اور نہ تکلف و تصنع سے پیدا کئے جا سکتے ہیں جو لوگ اقدارِ عالیہ کی محافظت کرنا چاہیں ان کو ان ہی قلندروں کی خو پیدا کرنی پڑے گی۔ ان ہی جیسا ایثار و اخلاق پیدا کرنا پڑے گا۔ مثلاً :-

ان کی معاشی زندگی تمام افراد سے زیادہ سادی ہو۔

ان کے اندر اخلاص، خدا پرستی و خدا ترسی بھی سب سے فزوں تر ہو۔

ان کو نہ کوئی قیمت خرید سکے اور نہ کوئی خوف دبا سکے۔

وہ اصول کی خاطر جئیں اور اسی کی خاطر مریں۔

دولت جمع نہ کریں، ان کے پاس جو کچھ آئے وہ غریبوں پر صرف کریں۔

اپنے لئے کسی امتیاز کے خواہش مند نہ ہوں۔

کردار کی بلندی کے ساتھ ان کی علمی و فکری سطح بھی بلند ہو اور وہ خود اقدارِ اسلامیہ کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور ان کی محافظت کی لگن رکھتے ہوں وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ ہے کہ یہ انقلاب وہی لوگ برپا کر سکتے ہیں جو فکر و عمل دونوں کا اعلیٰ نمونہ ہوں اور اپنے عیش کو اصول و اقدار کی خاطر قربان کر چکے ہوں۔ اقدارِ عالیہ کی تحسین اور زبانی جمع خرچ تو بہت آسان ہے اور سبھی کرتے ہیں لیکن عملی جذبہ پیدا کرنے والا صرف وہی ہوتا ہے جو خود عملی نمونہ ہو ان اقدار کا۔ ورنہ ایک چور اگر دوسروں کو وعظ کہتا پھرے کہ چوری چھوڑ دو، تو اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ اقدار سے محبت ہونے کا صرف ایک ہی مقیاس ہے، ایثارِ نفس اور قربانی۔ کوئی اعلیٰ قدر ایثار کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

قیام اقدارِ اسلامیہ کے لئے اصلی راستہ تو، میری نظر میں یہی ہے لیکن اگر یہ موجود نہ ہو تو ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ رہنا بھی کوئی عقلمندی نہیں۔ اس کیلئے ہمارا کوئی لائحہ عمل تو ضرور ہونا چاہیئے۔

اس پروگرام کا سب سے بڑا جز ہے تعلیم اور تربیت۔ ہماری تعلیم گاہوں میں ہر فن باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے لیکن اخلاقی اقدار کی تربیت برائے نام ہوتی ہے۔ برائے نام سے مراد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی اقدار کے متعلق کچھ کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں اور سبق یاد ہونے پر نمبر دے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اخلاق کو فقط حرفِ شناسی LITRACY

نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ دل میں اُتر جانے والا علم ہونا چاہیئے۔ ان کے نمبر صرف سبق کی یاد کے مطابق نہیں دیئے جانے چاہئیں بلکہ عملی امتحان کے مطابق ان کے نمبر ملنے چاہئیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیں پورا نظامِ تعلیم بدلنا پڑیگا، کتابیں بھی نئے انداز کی تجویز اور تصنیف کرنی پڑینگی۔ اساتذہ بھی وہی رکھنے ہوں گے جو اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوں اور تعلیم و تربیت ان کے نزدیک تنخواہوں سے زیادہ قیمتی ہو۔

ہم لوگ یہ بڑی غلطی کرتے ہیں جو تعلیم گاہوں میں تربیت اور تنظیم کو اخلاقی قوت کی بجائے قانونی دباؤ سے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ قانون تو صرف اُس خلا کو پُر کرنے کے لئے ہوتا ہے جو اخلاقی تحریکات کے بعد بھی باقی رہ جائے۔ نیز قانون صرف ان طبائع کے لئے ہے جن پر اخلاقی حربے ناکام ہو چکے ہوں۔ پوری زندگی اور اس کے نازک گوشوں کی تکمیل صرف قانونی دباؤ سے نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ پس ہماری تعلیم گاہوں کا انداز یہ ہونا چاہیئے، کہ ہر روز اخلاقی سطح بلند ہوتی جائے اور اسی تناسب سے قانونی گرفت ڈھیلی ہوتی جائے۔ ورنہ صرف قانونی گرفت جتنی زیادہ مضبوط کی جائے گی اسی قدر اس کی زد سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لئے قانونی چور دروازے بھی نئے سے نئے پیدا ہوتے جائیں گے۔

ایک بہت ضروری بات جو اقدارِ اسلامیہ کے قیام و اشاعت کے لئے لازمی ہے، وہ یہ ہے، کہ اس میں بڑی حکیمانہ اور نفسیاتی تدریج سے کام لینا چاہیئے جو فرد یا سوسائٹی مخاطب ہو اس کا نفسیاتی جائزہ لے کر اس کے اصل مرض کو پہلے بھانپنا چاہیئے اور اس کے مناسبِ حال ہی کوئی ایسی قدر تجویز کرنی چاہیئے جو کئی اقدار کی جامع ہو اور جس پر عمل کرنے کو وہ زیادہ دشوار نہ سمجھے، پھر جب عمل کرنے لگے تو دوسری اقدار خود بخود سمٹ کر اس میں آجائیں، اگر ساری اقدار کا بوجھ دفعتہً ڈال دیا جائیگا، تو اوّلاً تو وہ سب کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے گا۔ دوسرے اس سارے مجموعے کو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھنے کی وجہ سے سب ہی کو چھوڑ بیٹھے گا۔

اس سلسلے میں سنّت نبویہؐ ہمارے لئے بہترین راہنما ہے حضورِ اکرمؐ کے پاس جب بھی کوئی فرد یا وفد آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے سارا قرآن اور تمام قرآنی اقدار بیک وقت اُلٹ کر نہیں رکھ دیں بلکہ اس کے مناسبِ حال ایک یا چند نصیحتیں فرمائیں اور اسی سے اس کی پوری کایا پلٹ گئی۔ کسی کو صرف اتنا فرمایا، کہ "اپنی زبان پر قابو رکھو" کسی سے فرمایا کہ "جو بات دل میں خلش پیدا کرے اسے چھوڑ دو" کسی کو حکم ہوا کہ "مشکوک چیز کو چھوڑ کر یقینی بات کو اختیار کرو"۔ کہیں "امر" فرمایا۔ کہیں "نہی" فرمائی۔ کہیں دونوں کو یکجا کیا۔ پھر مختلف مواقع پر ایک ہی مخاطب کو مختلف احکام دیئے۔ غرض نبویؐ طریقہ اور نبویؐ زندگی تربیت کیلئے سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر طریقہ ہے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے، کہ اس کے فوری نتیجے کا انتظار صحیح نہ ہوگا۔ یہ کوشش نسلاً بعد نسلٍ جاری رکھنی پڑیگی اور ہماری کوششوں کا نتیجہ وہ ہوگا جو کبھی نہ کبھی ایک اچھے معاشرے کی شکل میں نمودار ہوگا۔

اس کے لئے ایک مستقل مرکزی تربیت گاہ ہونی چاہیئے۔ جس سے نکلے ہوئے افراد بہترین نمونۂ عمل بن کر اطراف ملک میں پھیل جائیں اور ہر طرف اصلاح کا جال پھیلا دیں۔ صوفیۂ کرام نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور بہ نسبت دوسرے اداروں کے ان کا مشن زیادہ کامیاب رہا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تربیت گاہ ایسی خانقاہوں کی شکل میں نہ ہونی چاہیئے جن کا دائرۂ اثر محدود ہو ورنہ یہ ہوگا کہ ایک محدود دائرے میں تو کچھ قدریں محفوظ رہیں گی، مگر بیرونی دنیا میں دوسری زوردار قوتیں اسے دبا دیں گی بلکہ ختم کر دیں گی اور ہماری محنت بار آور نہ ہو سکے گی۔ موجودہ دور میں دنیا سمٹ کر خود بخود وحدت عالم کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے بالکل پیوستہ ہیں اور ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے اس لئے تربیت گاہ میں جو افراد تیار کئے جائیں ان کو ایسے پختہ کردار کا حامل ہونا چاہیئے جو اپنے ماحول سے متاثر ہونے کی بجائے خود ماحول کو متاثر کریں، اور جس طرح تالاب کے وسط میں ایک ڈھیلا پھینکنے کے بعد موج آب کا دائرہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتے بڑھتے کناروں تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح مرکزی تربیت گاہ کا دائرہ اپنی قوت کے مطابق ساری زمین پر پھیلیگا۔ صرف تربیت کر دینا کچھ مشکل نہیں، مشکل ایسی تربیت کرنا ہے جو اپنے زہریلے ماحول سے متاثر ہو کر بدل نہ جائے بلکہ زمانے کا رخ بدل دے۔

اس ضمن میں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ کمیونزم اور اس کے اعمال و وظائف کے متعلق اسلام کا کیا رجحان ہے۔ اسلامی اقدار کا سرچشمہ قدر الاقدار یا اللہ ہے اور سارا نظام اسلامی اسی ایک مرکز کے گرد گردش کرتا ہے۔ یہ جڑ ہے اور باقی سب شاخیں، لہٰذا جو نظام اس اصل و اساس ہی کا منکر ہو وہ اگر چند اخلاقی اقدار پر ایمان رکھتا بھی ہو تو یقیناً اس کا مرکز ارتقا اور مقصود کا منتہا قدر الاقدار نہیں ہوگا۔ یہ گویا جڑ کو چھوڑ کر شاخوں اور پتوں پر پانی ڈالنا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیٹ کا مسئلہ حل کرنے کا جذبہ بھی اسلام کی نظر میں ایک اعلیٰ قدر ہے اور اسمائے حسنیٰ میں یہ اسم رزاق کا امتثال ہے۔ رزاقیت اور ربوبیت بہت بڑی اسلامی قدر ہے مسلمانوں نے اس کی طرف سے بے توجہی برت کر تباہی مول لی! اور کمیونزم نے اس کو اپنانے کی کوشش کی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کمیونزم نے اس جامع قدر کو نہایت ہی تنگ نظرانہ انداز سے، توڑ مروڑ کے اس کے اصلی مرکز اور قدر الاقدار سے کاٹ کے اس کو اپنانے کی کوشش کی، ــــ کمیونزم کی محرومی اور منزل مقصود سے دور تر رہنے کا اصل راز یہی ہے۔

انسان کا شکم بلاشبہہ زندگی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے لیکن انسان سر سے پاؤں تک صرف معدہ ہی نہیں، اس کے اندر دماغ بھی ہے جو ارتقا کی راہیں سجھاتا ہے۔ اس کے پاس دل بھی ہے، جو ہزاروں لطیف جذبات کی آماجگاہ ہے، شکم کا تقاضا ہے کھانا، اور جذبۂ ایثار کا اقتضا ہے کبھی خود بھوکے رہ کر کسی فاقہ کش کو کھلانا۔ انسان کے اندر انسانیت سے محبت ہے، عقیدت ہے،

اطاعت ہے، عبودیت ہے، جمال آفرینی ہے اور بے شمار ایسے لطیف جذبات ہیں جو تقاضائے شکم پر بھی بھاری ہیں۔ صرف شکم کا نظام اسلامی اقدار سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے؟ اسکے متعلق اقبال کے دو شعر سن لیجئے: —

رنگ و بو از تن نہ گیرد جانِ پاک　　جز بہ تن کارے نہ دارد اشتراک

دین آں پیغمبر حق ناشناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

شکمی ضرورتوں کی تکمیل صرف حیوانی ضرورت ہے، لیکن انسان صرف حیوان نہیں، حیوان سے آگے بھی کچھ ہے، وہ انسان ہے، قرآن اٰتوا الزکوٰۃ کو معاشی ضروریات کی تکمیل بتاتا ہے لیکن اقیموا الصلوٰۃ اس سے پہلے ہے، یعنی مذکورۂ بالا اخلاقی اقدار کا قیام۔ یہ نکتہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حصول کو فوقیت حاصل ہے۔ اٰتوا الزکوٰۃ حیوانی ضرورت ہے، مگر خاص انسانی ضرورت اقیموا الصلوٰۃ ہے جس سے کمیونزم خالی ہے۔ علاوہ ازیں کمیونزم کے نزدیک یہ دُنیا اور اس دُنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے، یہی اس کے سارے فلسفے کا ماحصل ہے، زندگی کا وہ ارتقا جو مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اسکے نزدیک بے معنی ہے لیکن اسلام میں اللہ کے ساتھ آخرۃ کا تصور ایک بنیادی تصور ہے۔ اسلئے جب تک خدا اور آخرت کا تصور نہ ہو کمیونزم یا کوئی دوسرا نظام، اسلام اور اہلِ اسلام کے لئے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

ریاض السنۃ

مصنفہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

قیمت آٹھ روپے

طبُّ العرب

مصنفہ پروفیسر براؤن

ترجمہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی

قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ (پاکستان)

شاہد حسین رزاقی

سعید حلیم پاشا کا نظریہ اصلاحِ امت

سید جمال الدین افغانی کی بے چین طبیعت، جمہوری خیالات اور انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کو مشرق و مغرب کے استبداد پسند ہمیشہ خوف اور شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اگر ایک طرف مصر، ترکی اور ایران کے بادشاہ ان کو اپنی غیر اسلامی مطلق العنانی کا دشمن سمجھتے تھے۔ تو دوسری طرف برطانیہ فرانس اور روس کے سامراجی انہیں اپنی شہنشاہیت اور سامراجی مفاد کے لئے بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سید جمال الدین کو جنہیں آج اہل ایران، ایرانی اور اہل افغانستان، افغانی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ تمام عمر کسی ملک میں بھی اطمینان سے رہنے اور منظم طور پر اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اسکے باوجود مختلف ممالک میں مختصر قیام کے دوران میں بھی انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے بعض ایسی ممتاز شخصیتوں کو اپنا حامی و ہم خیال بنالیا جنہوں نے اُن کے بعد بھی ان کے کام کو جاری رکھا اور مسلم ممالک کی بیداری اور اُن کے دور جدید کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا۔ سید جمال الدین کے ان حامیوں میں دو شخصیتیں بہت ممتاز نظر آتی ہیں۔ ایک تو مفتی محمد عبدہ اور دوسرے سعید حلیم پاشا۔

تعارف سعید حلیم پاشا کا تعلق مصر کے شاہی خاندان سے تھا۔ ان کے والد بہت روشن خیال اور قومی آزادی کے دلدادہ تھے۔ اس لئے ان کو انقلاب پسند قرار دیا گیا اور ان کی عمر کا بڑا حصّہ جلاوطنی میں گزرا۔ طرح طرح کی مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے ہونہار لڑکے سعید حلیم کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ اور اعلیٰ مغربی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پورا خیال رکھا کہ اسلامی و مشرقی علوم میں بھی وہ مہارت پیدا کریں۔ چنانچہ سعید حلیم نے ترکی و عربی کے علاوہ فرانسیسی و انگریزی زبانوں پر بھی پورا عبور حاصل کرلیا اور مشرق و مغرب کے علوم پر ان کی نظر بہت وسیع ہوگئی۔ دولت عثمانیہ کے متمول ترین طبقہ سے تعلق کے باوجود سعید حلیم پاشا اسلامی تہذیب و شائستگی کا ایک دلکش نمونہ اور اپنے عہد کے بڑے روشن خیال اور عالی دماغ مفکر تھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور انحطاط نے ان کی حساس طبیعت کو بہت متاثر کیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو احیائے قومی کی تحریکوں میں عملی حصہ لینے لگے۔ اور دوسری طرف مسلمانان عالم کی اصلاح و ترقی کی ایسی تجویزیں پیش کیں جو ان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے اور ترقی کی نئی شاہراہوں پر گامزن ہونے میں مدد دے سکیں۔

سید جمال الدین افغانی کے فیض صحبت نے ان کے جذبۂ حریت پسندی کو تیز تر کر دیا اور وہ عملی تحریکوں میں روز افزوں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں مجلسِ اتحاد و ترقی کے نوجوان رہنماؤں نے سلطان عبدالحمید کے خلاف جو انقلاب برپا کیا سعید حلیم بھی اُس کے